جاناں! جاناں!!

احمد فراز

جاناں جاناں

احمد فراز

جملہ
حقوق
محفوظ ـــــــ

ملنے کا پتہ :
نصرت پبلشرز
حیدری مارکیٹ۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ ۱

مصنف : احمد فراز
ناشر : نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔ ا
پرنٹرز : نامی پریس۔ لکھنؤ
قیمت : ۱۶ روپے
کتابت : وقار رضوی

فہرست

۱	یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں	۹
۲	اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں	۱۳
۳	اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے	۱۶
۴	اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون	۱۸
۵	خواب مرتے نہیں	۲۰۱
۶	ہر خواب عذاب ہو چکا ہے	۲۰
۷	یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جُدا	۲۲
۸	جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا	۲۴
۹	جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا	۲۵
۱۰	مت سوچو!	۲۶
۱۱	سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے	۲۸
۱۲	سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے	۲۹
۱۳	اب کس کا جشن مناتے ہو	۳۰
۱۴	ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے	۳۴
۱۵	شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے	۳۶

۱۶	دل گرفتہ ہی سہی بزم سجالی جائے	۳۷
۱۷	ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا	۳۸
۱۸	اے مرے یار قدح ریز	۴۰
۱۹	کہا تھا کس نے کہ عہد وفا کرو اس سے	۴۲
۲۰	تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے	۴۳
۲۱	ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا	۴۵
۲۲	سحر کے سورج!	۴۶
۲۳	وہ تو سب درد کے لمحے تھے	۵۱
۲۴	سوئے فلک نہ جانبِ مہتاب دیکھنا	۵۴
۲۵	ستمگری کا ہر انداز محرمانہ لگا	۵۶
۲۶	جو سزا ہم کو ملے	۵۸
۲۷	آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو	۶۰
۲۸	تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے	۶۲
۲۹	برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا	۶۴
۳۰	جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا	۶۶
۳۱	سچ بھی جھوٹا ہے	۶۷
۳۲	میں نے آغاز سے انجامِ سفر جانا ہے	۶۹
۳۳	میں کہ پھر دشتِ رفاقت کا سفر کر آیا	۷۱
۳۴	ہاتھ اٹھائے ہیں مگر لب پہ دعا کوئی نہیں	۷۳
۳۵	تو بہتر ہے یہی!	۷۴
۳۶	یہ جو نشے ہیں سفر کے نہ اتر جائیں کہیں	۷۷

۳۷	آنسو نہ روک دامنِ زخمِ جگر نہ کھول	۷۸
۳۸	عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا	۸۰
۳۹	ترچ میرا!	۸۲
۴۰	طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت	۸۵
۴۱	میں تو لب کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا	۸۶
۴۲	اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو	۸۸
۴۳	قلم سرخرو ہے!	۸۹
۴۴	آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے	۹۲
۴۵	وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا	۹۳
۴۶	دوست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا	۹۴
۴۷	خشک ناچ	۹۵
۴۸	جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو	۹۷
۴۹	نوحہ گروں میں دیدۂ تر بھی اُسی کا تھا	۹۹
۵۰	زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اُجالوں جیسی	۱۰۰
۵۱	عید کارڈ	۱۰۱
۵۲	نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے	۱۰۲
۵۳	ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے	۱۰۳
۵۴	فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں	۱۰۴
۵۵	میسور کا!	۱۰۵
۵۶	تھی مرے جام میں دُردِ مئے تنہائی بہت	۱۰۷
۵۷	جو قربتوں کے نشے تھے وہ اَب اُترنے لگے	۱۰۹

۵۸ اپنی خوش گمانیوں میں کہیں جان سے بھی نہ جاؤ ۱۱۰
۵۹ طعنہ زن کیوں ہے مری بے سروسامانی پر ۱۱۱
۶۰ اہلِ تاشقند کے نام ۱۱۲
۶۱ خود آپ اپنی نظر میں، حقیر میں بھی نہ تھا ۱۱۳
۶۲ یوں تو محرومِ نوا کب سے دہن میرا تھا ۱۱۵
۶۳ ہوا کے زور سے پندارِ بام و در بھی گیا ۱۱۷
۶۴ ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے ۱۱۹
۶۵ کہا نہیں تھا! ۱۲۰
۶۶ قامت کو تیرے سرو صنوبر نہیں کہا ۱۲۴
۶۷ اتنا بے رنگ دکھ کو نہیں جانیے ہر رگِ جاں شعارِ بدن ہوئے گی ۱۲۵
۶۸ میں ترا قاتل ہوں! ۱۲۶
۶۹ جو سر بھی کشیدہ ہو اُسے دار کرے ہے ۱۲۸
۷۰ کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی ۱۳۰
۷۱ ہر کوئی جاتی ہوئی رُت کا اشارہ جانے ۱۳۲
۷۲ میں اکیلا کھڑا ہوں! ۱۳۳
۷۳ سلام اُس پر! ۱۳۶
۷۴ گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی ۱۳۹

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں

یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں

میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں

تو ایک اک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں

اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہوں

ہزار غم تھے جو زندگی کی!
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں

مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ھر اک بار تجھ کو چھُو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے

یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہ سوزاں گھٹا بنی ہے

یہ درد موجِ صبا ہُوا ہے
یہ آگ دِل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں

یہ دُکھ کے نوحے یہ سُکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں

جو تیری قربت، تری جُدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر، ترا مغنّی
وُہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں

وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں

وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اُس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پُوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دِنوں کا اُجڑ چکا ہے

وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے

وُہ تھک چُکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

"ق"

اوّل اوّل کی محبّت کے نشے یاد تو کر
بے پئے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقّع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخلِ زنداں جاناں

اَب ترا ذکر بھی شائد ہی غزل میں آئے
اَور سے اَور ہوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ روٹھی ہوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراقِ پریشاں جاناں

اے خُدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھّر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ سر ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا اُدھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز
شہرِ نا پرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب تختۂ ریگ ہے یہ چہرہ
دریا تھا سراب ہو چکا ہے

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

اب اور کوئی علاج غم کا
اب زہر شراب ہو چکا ہے

اُس رُت میں بھی بے نمو ہوں جس میں
کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں، ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھُنکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے عَلَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

○

یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جُدا
لیکن اَب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جُدا

دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
"میں جدا گریہ کناں، ابر جدا یار جدا"

کج کلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرّہ دستار جدا

اس قدر روپ ہیں یاروں کے کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جدا اور سرِ دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

○

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اُس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اُس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دِل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اُس کو ندامت تھی اسقدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انھیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

مت سوچو

اور اس نے
مرے ساغر میں
مئے سرخ انڈیلی ـــــ تو کہا
مت سوچو

تم یہاں آئے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس حجلۂ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں
نغمہ بلب

مست ادا مت سوچو
جاگتی رات
کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا

مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو
پردیس بھی آتے ہو
تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دلِ افگار

عزیزانِ وطن کی یادیں
اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح
جن کے دھبّوں کو تو
خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں
یہ جو زنگار ہیں غربت کے
خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں
آلائشیں جسموں کی ہیں
اس طرح سنبھالے ہوئے پھرتے ہو
کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں
اس گھڑی تم ہو جہاں
مملکتِ خواب نہیں
یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں
زندگی مے کی طرح
شوخ ہے طرّار ہے
زہر اب نہیں
اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ
کہ دریوزہ گری
اس جگہ شاملِ آداب نہیں
مت سوچو!

سنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجومِ سرِ راہگزر راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فراز اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنّا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کے گیت سناتے ہو
اُس تن من کا جو دو نیم ہوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عُدو کے نام ہوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بدقسمت تھا
راہوں میں بہایا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کھلایا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کو تم نے
نیزے کی اَنی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفّت
لٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسا کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

اِن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں،

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اس قصے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اس جشن میں مَیں بھی شامل ہوں
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دِل کی موت عہد وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترک محبت کرے کرے

اَب اپنا دِل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گُل بن کے پھُوٹتا ہے لہُو شاخسار سے
زخمِ رگِ بہار ہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مَرے مَرے

○

شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گلِ حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر رِدا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاک جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری ابتدا بہار کی ہے

○

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وُہ مروّت سے ملا ہے تو جُھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

○

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آگئی
وہ اِک دیا بجھا تو سینکڑوں دیئے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دلنواز تھی
وہ یارِ کم سُخن کئی حکایتیں سُنا گیا

اب اک ہجوم عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اس ریاض دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا

شریک بزم دل بھی ہیں چراغ بھی ہیں پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اٹھو ستم زدو چلیں یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جسکو راس آگیا

یہ آنسوؤں کے ہار تو بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

اے مرے یارِ قدح ریز!

چاند نکلا ہے مری آنکھ
مرے دل میں اُتارے ہے تجھے
آ مرے یارِ قدح ریز
مرا جام پکارے ہے تجھے

یُوںہی تنہائی میں بیٹھا تھا
سرِ شام بُھلائے ہوئے ساری دنیا
یونہی اک یاد سی جاگ اُٹھی
تو لگنے لگی پیاری دُنیا

میں تو جیسا بھی ہوں خوش وقت ہوں
کیسی ہے تمہاری دنیا
تم نے جس داؤں سے جیتا ہے
اسی بازی میں ہاری دنیا

آ مرے یارِ قدح ریز
مرا جام ہے خالی کب سے
مرا دل چور ہے زخموں سے
میری آنکھ سوالی کب سے
پیشِ منظر میں اب آ جاؤ
کہ ہیں اصنام خیالی کب سے
منتظر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرح
یوں بجاتے رہیں تالی کب سے
آ مرے یارِ قدح ریز
مرا نام ہے گالی کب سے

کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے

یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانۂ دل ابتدا کرو اس سے

یہ کیا کہ تم ہی غمِ ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سنا کرو اس سے

فراز ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے، کہ کم کم ملا کرو اُس سے

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

○

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا، کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جُڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تو بھی دل کو اک لہو کی بوند سمجھا ہے فرازؔ
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سورج

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہو لہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے
میرا دل ہے
مری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشاں
مری آبرو ہے
لہو لہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے

تری شعاعوں کا نور اندھیروں میں
گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے
سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں
سحر کے سورج
ستم کی آندھی رکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جاگنے کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھو
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں
سحر کے سورج

مری نظر میں تو اُن رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے
قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علم اُٹھائے
چلے تھے گھر سے
یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پہ نہ حرف آئے
سحر کے سُورج
مری نظر میں انھیں رفیقوں کے قافلے ہیں
کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پابہ زنجیر
منفعل گردنیں جھکائے
عدو کے نرغے میں
ان اندھیروں کی سرزمین کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن
نفرت کے سنگ
رسوائیوں کے بازار
منتظر ہیں
وہاں
جہاں میری ساری تاریخ کے ورق شرمسار ہوں گے
سحر کے سورج
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے
یہ غازیوں کی نظر نہ دیکھے
یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا
چھچھاتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تو نہ دیکھے

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

وہ تو اِک خواب پریشاں تھا جو میں نے دیکھا
وہ تو سب درد کے لمحے تھے

جو مجھ پہ گزرے

میرے ویران مہ و سال
میرے شام و سحر
میری مجروح محبت۔ مری داماں طلبی
سرِ دہلیزِ رقیباں

مری دریوزہ گری

آنکھ میں اشک ندامت کے
تو چہرے پہ فشارِ دل و جاں
میرا ماضی بھی اندھیرا
مرا فردا بھی دھواں

میں کہاں ڈھونڈتا
کھوئی ہوئی ہستی کے نشاں
تو یہاں تھا نہ وہاں
میں یہاں تھا نہ وہاں
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پہ گزرے

پھر یہ کیوں ہے
کہ میرا جسم مرا خوں
نہ ہوا خاکستر
کون اس درد کے دوزخ میں
مہ و سال تلک جل کے بھی
استادہ رہا
زندہ رہنے پہ مصر
اور نئی زیست کا دلدادہ رہا
نئی سج دھج سے بسر کرنے پہ آمادہ رہا
بس اسی درد کے دوزخ کا رہا ہوں ایندھن
اب جو ابھرا ہوں تو اس آگ سے کندن ہو کر

میں نے اس حسن کو پایا ہے بہت کچھ کھو کر
اپنے بکھرے ہوئے پندار
کا ریزہ ریزہ
چن رہا ہوں شب صحرا سے ستاروں کی طرح
اپنے ملبوسِ دریدہ کے پریشاں ٹکڑے
جنبش سوزنِ اُمید کی خیاطی سے
سی رہا ہوں کہ مرا اِسم برہنہ نہ رہے
میرے دیرینہ حریفوں کے لبوں پر کوئی طعنہ نہ رہے
مجھ پہ قرضِ غمِ جان و غمِ دنیا نہ رہے
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پر گزرے
اور اَب میں نئے موسم میں
کسی شعلۂ بے باک کسی پرچم پرّاں کی طرح
کرۂ خاک میں لہرانے لگا ہوں پھر سے
اے مرے لمحۂ آئندہ مرے شوق کے فردا
تری منزل کی طرف آنے لگا ہوں پھر سے
اپنے خاشاک کو
انگار سے چمکانے لگا ہوں پھر سے

سوئے فلک نہ جانبِ مہتاب دیکھنا
اس شہرِ دلنواز کے آداب دیکھنا

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

وہ موجِ خوں اُٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
اب کے فصیلِ شہر کو غرقاب دیکھنا

ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کم یاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

پھر خونِ خلق و گردنِ مینا بچائیو
پھر چل پڑا ہے ذکرِ مئے ناب دیکھنا

آباد کوئے چاکِ گریباں جو پھر ہوا
دستِ رقیب و دامنِ احباب دیکھنا

ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بے دلی کے ساتھ
اِس انجمن میں اے دلِ بیتاب دیکھنا

حد چاہیے فراز وفا میں بھی اور تمھیں
غم دیکھنے نہ دِل کی تب و تاب دیکھنا

○

ستم گری کا ہر انداز مجرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سُخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سُنایا اسے فسانہ لگا

برونِ در نہ کوئی روشنی نہ سایہ تھا
سبھی فساد مجھے اندرونِ خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اُڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

اس عہدِ ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اک زمانہ لگا

جو سزا ہم کو ملے.....

اور ہمیں درد کی منزل پہ پہنچنے والے
کہہ رہے ہیں کہ اسے اور بھی آسان کرو
تاکہ ہم اپنے پرائے کو بھی پہچان سکیں
اور کچھ دوست اسی راہ میں قربان کرو

شام آئی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر
جو کبھی خونِ تمنا کبھی گلزار لگے
اتنی آشفتہ نہ تھی خواہشِ یاراں پہلے
اب تو ہر جذبۂ آسودہ بھی تلوار لگے

تو کہ تنہا ہے مری طرح تو مجبور نہ بن
کارواں اُتریں گے اس کوہِ ندا سے کتنے
شمعیں بجھ جائیں گی، خورشید اُبھر آئینگے
اور اسی ساحلِ امید سے پیاسے کتنے

یوں پکاریں گے کہ یہ بوند سمندر کر دے
آج مصلوب جو ہو اس کو پیمبر کر دے
یہ جو ہونا ہے تو ہم یونہی گنہگار رہیں
جو سزا ہم کو ملے اس کے سزاوار رہیں

○

آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مِرا ہم خیال ہو

اب کے وہ درد دے کہ میں روؤں تمام عُمر
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

پہلے وہ اضطراب، مجھے کس طرح بھلائیں
اب یہ عذاب کیسے طبیعت بحال ہو

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

پھر تو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فرازؔ
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی اُداسی کم نہیں ہے

ہمیں بھی یاد ہے مرگِ تمنّا
مگر اب فرصتِ ماتم نہیں ہے

ہوائے قربِ منزل کا بُرا ہو
فراقِ ہمسفر کا غم نہیں ہے

جنونِ پارسائی بھی تو ناصح
مری دیوانگی سے کم نہیں ہے

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

قیامت ہے کہ ہر مے خوار پیاسا
مگر کوئی حریفِ جم نہیں ہے

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

فرازؔ اس قحط زارِ روشنی میں
چراغوں کا دھواں بھی کم نہیں ہے

○

برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جسطرح راستا سا

خوابوں میں خواب اسکے یادوں میں یاد اسکی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رُخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا

جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

خواہشیں یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بجھتی ہیں
اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا

یار خوش ہیں کہ انھیں جامۂ احرام ملا
لوگ ہنستے ہیں کہ قامت سے زیادہ پہنا

یار پیماں شکن آئے اگر اب کے تو اسے
کوئی زنجیرِ وفا اے شبِ وعدہ پہنا

غیرتِ عشق تو مانع تھی مگر میں نے فراز
دوست کا طوق سرِ محفلِ اعدا پہنا

سچ بھی جھوٹا ہے

سچ بھی جھوٹا ہے
کہ اس کے بھی کئی چہرے ہیں
ایک چہرہ کہ ترے قرب کی ساعت میں مجھے
نہ کوئی خواہشِ آغوش رہی
اور نہ تمنائے وصال
ایک چہرہ کہ
ترے جسم کی حرمت کی قسم کھا کے
ہر اک دیدۂ مشکوک کو سمجھاتا رہا

آسمانوں کے صحیفوں سے اتارے ہوئے
الفاظ کو دہراتا رہا

ایک چہرہ
کہ ترے پاس سے اُٹھا ہوں
تو خود سوچتا ہوں
کہ مرا سرد لہو
گرمیِ شوق سے اور آتشِ محرومی سے
کیوں چھلکتا ہے

اور بدن
نشے کے عالم میں بھی کیوں دکھتا ہے،

میں نے آغاز سے انجامِ سفر جانا ہے
سب کو دو چار قدم چل کے ٹھہر جانا ہے

غمِ وہ صحرائے تمنّا کہ بگولے کی طرح
جس کو منزل نہ ملی اسکو بکھر جانا ہے

تیری نظروں میں مرے درد کی قیمت کیا تھی
میرے دامن نے تو آنسو کو گہر جانا ہے

اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت ترے پندار کو مر جانا ہے

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اُس کو ٹھہر جانا ہے

تیز سُورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لیے رُکنا ہے گزر جانا ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا بُرا ہو کہ فراز
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے

میں کہ پھر دشت رفاقت کا سفر کر آیا
کیا کہوں کتنی اذیت سے گزر کر آیا

ہر کوئی ہم سے ملا عمرِ گریزاں کی طرح
وہ تو جس دل سے بھی گزرا وہیں گھر کر آیا

تم نے اک سنگ اٹھایا مرے آئینے پر
اور ہر شخص کو میں آئینہ گر کر آیا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شہرِ وفا کیسا ہے
ایسے لگتا ہے صلیبوں سے اُتر کر آیا

صرف چہرے ہی اگر کرب کے آئینے ہیں
کیوں نہ ہمیں دل کا لہو آنکھ میں بھر کر آیا

اب جو اس شہر کی تقدیر ہو، میں تو لوگو
درو دیوار پہ حسرت کی نظر کر آیا

ہم تو سمجھے تھے محبت کا پیمبر ہے فراز
اور وہ بے مہر بھی توہینِ ہنر کر آیا

ہاتھ اُٹھائے ہیں مگر لب پہ دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو وہ جس کی جزا کوئی نہیں

یہ بھی وقت آنا تھا، اب تو گوش بر آواز ہے
اور میرے بربطِ دل میں صدا کوئی نہیں

آ کہ اب تسلیم کر لیں، تو نہیں تو میں سہی
کون مانے گا کہ ہم میں بے وفا کوئی نہیں

وقت نے وہ خاک اُڑائی ہے کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقشِ پا کوئی نہیں

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

کیسے رستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز
یا ہجومِ دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

تو بہتر ہے یہی

یہ تری آنکھوں کی بے زاری یہ لہجے کی تھکن
کتنے اندیشوں کی حامل ہیں یہ دل کی دھڑکنیں

پیشتر اس کے کہ ہم پھر سے مخالف سمت کو
بے خدا حافظ کہے چل دیں جھکا کر گردنیں

آؤ اس دکھ کو پکاریں جسکی شدت نے ہمیں
اس قدر اک دوسرے کے غم سے وابستہ کیا

وہ جو تنہائی کا دُکھ تھا تلخ محرومی کا دُکھ
جس نے ہم کو درد کے رشتے میں پیوستہ کیا

وُہ جو اس غم سے زیادہ جاں گسل قاتل رہا
وُہ جو اک سیلِ بلا انگیز تھا اپنے لیے

جس کے پَل پَل میں تھے صدیوں کے سمندر موجزن
چیختی یادیں لیے اُجڑے ہوئے سپنے لیے

میں بھی ناکامِ وفا تھا تو بھی محرومِ مراد
ہم یہ سمجھے تھے کہ دردِ مشترک راس آ گیا

تیری کھوئی مسکراہٹ قہقہوں میں ڈھل گئی
میرا گم گشتہ سکوں پھر سے مرے پاس آ گیا

تپتی دوپہروں میں آسودہ ہوئے بازو مرے
تیری زلفیں اس طرح بکھریں کہ گھٹائیں ہو گئیں

تیرا برفیلا بدن بے ساختہ لَو دے اٹھا
میری سانسیں شام کی بھیگی ہوائیں ہو گئیں

زندگی کی ساعتیں روشن تھیں شمعوں کی طرح
جس طرح سے شام گزرے جگنوؤں کے شہر میں

جس طرح مہتاب کی وادی میں دو سائے رواں
جس طرح گھنگرو چھنک اٹھیں نشے کی لہر میں

آؤ یہ سوچیں بھی قاتل ہیں تو بہتر ہے یہی
پھر سے ہم اپنے پرانے زہر کو امرت کہیں

تو اگر چاہے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفاؤں کے لیے روتے رہیں

○

یہ جو نشّے ہیں سفر کے نہ اُتر جائیں کہیں
کوئی منزل نہ سہی سامنے پر جائیں کہیں

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

تجھ کو یہ دُکھ کہ مری چارہ گری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں

اس خلا میں تو زمیں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
کوئی قلزم ہو کہ دلدل ہو اُتر جائیں کہیں

گھر سے نکلے تھے کہ دنیا نے پکارا تھا فرازؔ
اب جو فرصت ملے دنیا سے تو گھر جائیں کہیں

آنسو نہ روک دامنِ زخمِ جگر نہ کھول
جیسا بھی حال ہو نگہِ یار پر نہ کھول

جب شہر لُٹ گیا ہے تو کیا گھر کو دیکھنا
کل آنکھ نم نہیں تھی تو اب چشمِ تر نہ کھول

چاروں طرف ہیں دامِ شنیدن بچھے ہوئے
غفلت میں طائرانِ معانی کے پر نہ کھول

کچھ تو کڑی کٹھور مسافت کا دھیان کر
کوسوں سفر پڑا ہے ابھی سے کمر نہ کھول

عیسا نہ بن کہ اُس کا مقدر صلیب ہے
انجیلِ آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

امکاں میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

میری یہی بساط کہ فریاد ہی کروں
تو چاہتا نہیں ہے تو بابِ اثر نہ کھول

تو آئینہ فروش و خریدار کور چشم
اس شہر میں فرازؔ دکانِ ہنر نہ کھول

عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

یہ کون پھر سے انہیں راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لبِ چارہ گر سے نکلا تھا

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے رویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا

یہ اَب جو سر ہیں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عیب بھی تو ہم اہلِ ہُنر سے نکلا تھا

وُہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فرازؔ
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

ترچ میرا

ترچ میر!
میں ترے قدموں میں
اک بے وقر سنگ ریزے کی صورت
تری جاں رُبا رِفعتوں کی طرف دیکھتا ہوں
تری چوٹیاں
برف کے تاج پہنے
ازل سے اسی تمکنت سے ستادہ ہیں
سورج کی لالی میں ڈوبے ہوئے ابر
ان کا لبادہ ہیں
اور آسمانی ہواؤں کی مانند
مشرق سے مغرب تلک
ان کے دامن کشادہ ہیں
اَے آسمانی ہواؤں کے مسکن
تری آنکھ نے

روز و شب کے سپید و سیہ
ان گنت قافلوں کا تماشا کیا ہے
تری بے صدا گھاٹیوں سے
کئی فاتحوں کے جری لشکروں نے گزرتے ہوئے
صاف و شفاف چشموں کا پانی پیا ہے
مگر
وقت کی آبجو کی طرح
تیرے پہلو میں بہتا ہے
اور ان کی تاریخ کہتا ہے
جو اب عدم کا سفر کر چکے ہیں
جو تیرے مکینوں کی مانند
زندہ ہیں
پر مر چکے ہیں
میں اُن کی صدا سُن رہا ہوں
تو کیا
اپنے مُردوں کی پرچھائیاں
صرف غیظ و غضب جانتی ہیں
تو کیا قہر ہی
ان کی برحق عدالت کا دستور ہے
صرف ادبار کی بجلیاں
ان کا سارا اثاثہ ہیں

اور اپنی درگاہ کے سائلوں میں
ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں
قیامت ہے
اے اپنے آبا کی رُوحوں کے مسکن
کہ وادی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی نحوست ہے
اور مرد و زن، ڈھور ڈنگر
سبھی بھوک سے اَدھ مُوئے ہو رہے ہیں
ہمارے سیہ بخت بچے فلاکت کے غاروں میں دبکے ہوئے
تیرے سورج کی ضو کو ترستے ہیں
پالے کی شدت سے ہر اک چراگاہ
صحرا کی مانند سُوکھی پڑی ہے
اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں
کی خونخوار آنکھیں ہمیں حرص سے
دیکھتی ہیں
ترے موسموں اور گھٹاؤں کی بخشش
فقط قحط ہے
قہر ہے
غیض ہے
اے ترے رحم میر
تو کتنا بے فیض ہے!

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہرِ رسوائی درِ جاناں سمیت

اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پُرنم ہے دلِ آزاراں سمیت

اِک فقیہہِ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت

یہ رعونت تا بکے اے دلِ فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرّۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

وُہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فرازؔ
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

میں تو لب کھول کے پابندِ سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تو صاحبِ محفل ٹھہرا

کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل، کوئی قاتل ٹھہرا

خوابِ آوارہ کسی آنکھ کی تقدیر تو بن
کسی منزل پہ کبھی قافلۂ دل ٹھہرا

مجھ کو بھی تیری اُداسی دلِ ویراں سی لگی
میں بھی اے شہرِ جُدائی ترے قابل ٹھہرا

کیا گلہ تجھ سے کہ آشوبِ جہاں ایسا ہے
میں بھی اے یار تری یاد سے غافل ٹھہرا

خوشنوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا

کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جانِ فراز
نہ ترا درد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا

اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف، خون کو پانی کوئی لکھو

کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہوئے
کیوں رک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

کیوں اہلِ شوق سر بگریباں ہیں دوستو
کیوں خوں بہ دل ہے عہدِ جوانی کوئی لکھو

کیوں سرمہ در گلو ہے ہر اک طائرِ سخن
کیوں گلستاں قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو

ہاں تازہ سانحوں کا کرے کون انتظار
ہاں دل کی واردات پرانی کوئی لکھو

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اُس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازو سناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں

کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے، جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا نہ تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم سرخرو ہے

کہ اس نے لکھا تھا

وہ بازو

جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب ان کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے
جو اہلِ وفا واقفِ آداب بہت تھے

اس شہرِ محبّت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے

کچھ دل ہی نہ مانا کہ سبک سر ہوں وگرنہ
آسودگیٔ جاں کے تو اسباب بہت تھے

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

اب دیکھ یہ حسرت بھری اُجڑی ہوئی آنکھیں
دُنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے

میں کیوں نہ فرازؔ اُن کی طرح مہر بہ لب تھا
اس بات سے ناخوش مرے احباب بہت تھے

وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا
اگر چلا ہے تو جو کچھ مجھے دیا لے جا

مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی تیر تو اٹھا لے جا

یہی ہے قسمتِ صحرا یہی کرم تیرا
کہ بوند بوند عطا کر گھٹا گھٹا لے جا

غرورِ دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اس کے سامنے دامانِ التجا لے جا

ندامتیں ہوں تو سر بارِ دوش ہوتا ہے
فراز جاں کے عوض آبرو بچا لے جا

دوست کبھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
یہ تو مجھ پہ اب کھلا ظالم کہ تو میرا نہ تھا

اس طرح خوش ہو رہا ہوں جشنِ مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوکِ خنجر پر لہو میرا نہ تھا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

وہ کہیں بھی چھوڑ جاتا کیا گلہ اس سے کہ وہ
اک مسافر تھا شریکِ جستجو میرا نہ تھا

اب تو خود سے بولتے میں خوف آتا ہے فراز
اتنا دلِ آزار طرزِ گفتگو میرا نہ تھا

خٹک ناچ

اک ہاتھ میں رُومال ہے اک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار
جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار
ہر بات پہ تیار
کہسار کے سورج کی طرح گرم و شفق رو
خیبر کی ہواؤں کی طرح تند و تنک خو
یہ نغمۂ دلدار کبھی — شعلۂ بیدار
پشتون کا کردار

یہ مردِ کہستاں جو چٹانوں میں ڈھلا ہے
شاہیں صفت آزاد فضاؤں میں پلا ہے
رقصندہ درخشندہ و تابندہ و طرّارہ
پشتون کا کردار

یہ رقص وفا کا بھی، جنوں کا بھی یہی رقص
جینے کی ادا گردشِ خوں کا بھی یہی رقص
وہ جنگ کا میدان ہو یا امن کا دربار
پشتون کا کردار

جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار
ہر بات پہ تیار
پشتوں کا کردار

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

یہ خواب ہے، خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دھند ہے، بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو

اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہوں کہ کوئی اور ہے دنیا ہے کہ تم ہو

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

یہ عمرِ گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

ہر بزم میں موضوعِ سخن دل زدگاں کا
اب کون ہے شیریں ہے کہ لیلیٰ ہے کہ تم ہو

اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

وہ وقت نہ آئے کہ دلِ زار بھی سوچے
اس شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو

آباد ہم آشفتہ سروں سے نہیں مقتل
یہ رسم ابھی شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو

اے جانِ فراز اتنی بھی توفیق کسے تھی
ہم کو غمِ ہستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو

نوحہ گروں میں دیدۂ تر بھی اُسی کا تھا
مجھ پر یہ ظلم بارِ دگر بھی اُسی کا تھا

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہُنر بھی اُسی کا تھا

آنکھیں کشاد و بست سے بدنام ہو گئیں
سورج اُسی کا خوابِ سحر بھی اُسی کا تھا

خنجر در آستیں ہی مِلا جب کبھی ملا
وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اُسی کا تھا

نشتر چُبھے ہوئے تھے رگِ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اُسی کا تھا

محفل میں کل فراز ہی شاید تھا لب کشا
مقتل میں آج کاسۂ سر بھی اُسی کا تھا

زُلف راتوں سی ہے رنگت ہے اجالوں جیسی
پر طبیعت ہے، وہی بھولنے والوں جیسی

اک زمانے کی رفاقت پہ بھی رم خوردہ ہے
اُس کم آمیز کی خو بو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

اس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں مرے بالوں جیسی

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

عید کارڈ

تجھ سے بچھڑ کر بھی زندہ تھا
مر مر کر یہ زہر پیا ہے
چپ رہنا آسان نہیں تھا
برسوں دِل کا خون کیا ہے
جو کچھ گزری جیسی گزری
تجھ کو کب الزام دیا ہے

اپنے حال پہ خود رویا ہوں
خود ہی اپنا چاک سیا ہے
کتنی جانکاہی سے میں نے
تجھ کو دل سے محو کیا ہے
سنّاٹے کی جھیل میں تو نے
پھر کیوں پتّھر پھینک دیا ہے

○

نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

وصالِ ہجر کی حسرت میں جوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے

بہت سے زخم ہیں ایسے جو ان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرِ دوستاں ہمارے ہوئے

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہوئے

گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہوا کہ وہی بادباں ہمارے ہوئے

فراز منزلِ مقصود بھی نہ تھی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساتھی رواں ہمارے ہوئے

فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں

لبِ دہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اداس ہوں بھی نہیں

مری زباں کی لکنت سے بدگمان نہ ہو
جو تو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

دکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اسی دیار کا میں بھی ہوں اور رہوں بھی نہیں

فراز جیسے دیا قربتِ ہوا چاہے
وہ پاس آئے تو ممکن ہے میں رہوں بھی نہیں

میورکا

(اسپین کا ایک خوبصورت جزیرہ)

میورکا کے ساحلوں پہ کس قدر گلاب تھے
کہ خوشبوئیں تھیں بے طرح کہ رنگ بے حساب تھے

تنک لباسیاں شناوروں کی تھیں قیامتیں
تمام سیم تن شریکِ جشنِ شہرِ آب تھے

شعاعِ مہر کی ضیا سے تھے جگر جگر بدن
قمر جمال جن کے عکس روشنی کے باب تھے

کھلی فضا کی دھوپ وہ کہ جسم سانولے کیے
بُتان آذری کہ مست غسلِ آفتاب تھے

یہیں پتہ چلا کہ زیست حُسن ہے بہار ہے
یہیں خبر ہوئی کہ زندگی کے دُکھ سراب تھے

یہیں لگا کہ گردشوں کے زاویے بدل گئے
نہ روز و شب کی تلخیاں نہ وقت کے عذاب تھے

مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم
مری نظر میں تیرے خد و خال تیرے خواب تھے

میں دُوریوں کے باوجود تیرے آس پاس تھا
میور کا کے ساحلوں پہ میں بہت اُداس تھا

○

تھی مرے جام میں دُردِ مئے تنہائی بہت
کل کسی یارِ قدح ریز کی یاد آئی بہت

نہ کوئی مونسِ دل تھا نہ کوئی دشمنِ جاں
پہلے پہلے تو طبیعت مری گھبرائی بہت

کیٹس کی قبر پہ پہنچا تو بھر آئی آنکھیں
اُس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

نشہ اُترا تو بدن یوں تھا شکستہ جیسے
بادہ پیمائی تھی کم بادیہ پیمائی بہت

اب تو رشک آتا ہے یاروں کی جوانمرگی پر
زندگی میں بھی کبھی تھا تیرا شیدائی بہت

رُوم کا حُسن بہت دامنِ دل کھینچتا ہے
اے مری خاکِ پشاور تری یاد آئی بہت

اوّلِ عشق کی بات اور تھی جو بھی ہوتا
اب تو ملنے کہ نہ ملنے میں ہے رسوائی بہت

اب فرازؔ اپنے مسیحا سے بھی اُمید نہ رکھ
وہ تنک دل ہے ترے زخم میں گہرائی بہت

○

جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اُترنے لگے
ہوا چلی ہے تو جھونکے اُداس کرنے لگے

گئی رُتوں کا تعلّق بھی جان لیوا تھا
بہت سے پھول نئے موسموں میں مرنے لگے

وہ مدّتوں کی جُدائی کے بعد ہم سے ملا
تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے

غزل میں جیسے ترے خدّ و خال بول اُٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

بہت دنوں سے وہ گمبھیر خامشی ہے فرازؔ
کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے

———

انھیں خوش گمانیوں میں کہیں جان سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

یہ اُداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو کسی درد کو جگاؤ

وہ کہانیاں اَدھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری
انھیں مَیں بھی کیوں سناؤں انھیں تم بھی کیوں سُناؤ

یہ جُدائیوں کے رستے بڑی دُور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا مری بات مان جاؤ

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک
جو تمھیں بُھلا چکا ہے اُسے تم بھی بھول جاؤ

طعنہ زن کیوں ہے مری بے سر و سامانی پر
اک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر

واعظو میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

ان کے ملبوس میں پیوند مرے جسم کے ہیں
اور یاروں کی نظر ہے مری عریانی پر

وقت رکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر

کشتیٔ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فرازؔ
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

اہلِ تاشقند کے نام

(ایک مجسمہ دیکھ کر)

کانسی کے مجسمے میں کیا کیا
اظہار ہے، کرب ہے نمو ہے

انسان کے عزم کی علامت
فطرت کے ستم کے رُوبرو ہے

ہاتھوں میں غضب کا حوصلہ ہے
ماتھوں میں جلال آبرو ہے

آنکھوں میں وقار فاتحانہ
چہروں پہ گلاب سا لہو ہے

ہر بار بلا کا رن پڑا تھا
ہر بار حیات سرخرو ہے

جیسے کہ مجسمے میں میں ہوں
جیسے کہ مجسمے میں تو ہے

تاشقند - ۱۹۷۶ء

○

خود آپ اپنی نظر میں حقیر میں بھی نہ تھا
اس اعتبار سے اُس کا اسیر میں بھی نہ تھا

بنا بنا کے بہت اُس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر میں بھی نہ تھا

نبھا رہا ہے یہی وصفِ دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی
وہ خوش مزاج اگر تھا تو میں بھی تھا

میں برگِ آخرِ شہرِ خزاں تھا خاک ہوا
کھلا کہ موسمِ گل کا سفیر میں بھی نہ تھا

میں کہہ رہا تھا رفیقوں سے جی کڑا رکھو
چلا جو درد کا اک اور تیر میں بھی نہ تھا

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فرازؔ
سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا

○

یوں تو محرومِ نواکب سے دہن میرا تھا
پھر بھی چرچا ہوا جس کا وہ سخن میرا تھا

میں نے کس نشۂ نخوت میں کماں کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اُترا وہ بدن میرا تھا

تو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تارِ کفن میرا تھا

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

آخری شامِ خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا

میری آنکھوں نے جو دیکھا مرے لب پر آیا
میری تقصیر یہی بے ساختہ پن میرا تھا

تھی اُفق تا بہ اُفق یوں تو مری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

ہوا کے زور سے پندار بام و در بھی گیا
چراغ کو جو بچاتے تھے اُن کا گھر بھی گیا

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اُتر بھی گیا

اب احتیاط کی دیوار کیا اُٹھاتے ہو
جو چور دِل میں چُھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چُپ رہا کہ اسی میں تھی عافیت جاں کی
کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا

سُلگتے سوچتے ویران موسموں کی طرح
کڑا تھا عہدِ جوانی مگر گزر بھی گیا

جسے بھُلا نہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
جو نام لب پہ رہا ذہن سے اُتر بھی گیا

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

مگر فلک کو عداوت اسی کے گھر سے تھی
جہاں فراز نہ تھا سیلِ غم ادھر بھی گیا

ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اے دل اسے بھلا ہی دے

لُٹنے والے سے یوں گریز نہ کر
کیا خبر وہ تجھے دعا ہی دے

جس کے چہرے پہ میری آنکھیں ہیں
وہ مجھے طعنِ کم نگاہی دے

یہ بھی اک شیوۂ رفاقت ہے
جانے والوں کو راستہ ہی دے

جانکنی کے عذاب سے نکلوں
آخری تیر بھی چلا ہی دے

اب تو جیسے فراز بادِ مراد
زندگی کا دیا بجھا ہی دے

کہا نہیں تھا

کہا تھا
اس شہر کو نہ جاؤ
اَب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے
تو رو رہے ہو
کہ اَب وہاں تم نہیں
نئے لوگ بس گئے ہیں
کہا تھا
اب شہر آرزو

دشتِ جاں رُبا ہے

گئے زمانوں کی خوشبوئیں کب سے مر چکی ہیں

جدائیاں کام کر چکی ہیں

تمہارے نغموں کے نرم پودے

نئی رُتوں کی شدید لُو سے جھلس گئے ہیں

گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں کو

کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں

وہ گفتگوؤں کی آبجوئیں

سکوت کے ریگزار میں دفن ہو گئی ہیں

وہ عہد و پیماں کی فاختائیں

اُفق کے اُس پار کھو گئی ہیں

کہا تھا — وہ ساعتیں نہ لوٹیں گی

جو گئی ہیں

کہا تھا

تم قرب کے نشے میں

انا کے مینار چُن رہے ہو

کہا تھا

تم اس وفا کے صحرا میں

اپنی آواز سُن رہے ہو

ڈراؤنے خواب بُن رہے ہو

تمہیں بڑا زعم تھا

کہ آنکھوں کے آئینوں کو
ہر انجمن کو سجا رہے تھے
تمہیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لٹا رہے تھے
کہا تھا
ان آئینوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ
کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا
ان راستوں پہ اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے محوِ رقص ہوں گے
یہ آئینے
جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں
تمہارے اشکوں کی کانچ ہے بس
یہ برف کے پیکروں کے شعلے
تمہارے سانسوں کی آنچ ہے بس
فراق کی بات ہی جدا ہے
یہاں تو آنکھوں سے آئینوں سے
جو عکس اوجھل ہوا
تو پھر وہ کہیں نہیں تھا
پلٹ کے آئے تو کیا
نہ آئے تو کیا

کہ آنکھیں تو آئینے ہیں
اور آئینوں کو غرض نہیں ہے
کہ کون چہرہ نظر نشیں تھا
وہ کوئی پتھر تھا یا نگیں تھا
کہا نہیں تھا۔

○

قامت کو تیرے سرو و صنوبر نہیں کہا
جیسا بھی تو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا

اس سے ملے تو زعمِ تکلّم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا

اتنی مروّتیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
یاروں نے جو کہا مرے مُنہ پر نہیں کیا

مجھ سا گناہگار سرِ دار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سرِ منبر نہیں کہا

برہم بس اس خطا پہ امیرانِ شہر ہیں
ان جوہروں کو میں نے سمندر نہیں کہا

یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فراز خود کو پیمبر نہیں کہا

———

○

اتنے بے رنگ دُکھ کو نہیں جلنیے، ہر رگِ جاں شعاعِ بدن ہوئے گی
لوگ پھر سے اُچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوئے گی

تابکے یُونہی اختر شماری کرو، جوئے خوں اپنی رگ رگ سے جاری کرو
اور کچھ روز سینہ فگاری کرو، بزمِ خاموش، بزمِ سخن ہوئے گی

تُم نے ہونٹوں پہ مہریں لگا دیں تو کیا، تُم نے شمعیں نوا کی بجھا دیں تو کیا
جو حکایت شُنی اَن شُنی ہو گئی، اب وہی انجمن انجمن ہوئے گی

اَب تلاشِ مسیحا عبث دوستو، اب جو قاتل ہے بس جستجو اس کی ہو
وَرنہ نامِ خدا نا منزا ہوئے گا، اور خلقِ خدا بے کفن ہوئے گی

رُت کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اُس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصلِ دار و رسن ہوئے گی

میں ترا قاتل ہوں

میں ترا قاتل ہوں
اے مشرق تجھے مصلوب کر
میں جو عیسا کے لبادے
میں ترے بیمار فرزندوں کے گھر
آیا تھا
کل چارہ گری کے واسطے
میں نے ان سے کیا کیا
میں کہ درماں بن کے آیا تھا
ترے ناسور زخموں کے لیے

بارُود کا مرہم لیے
بندوق کا پرچم لیے
میرے بوجھل بوٹ
جن کی چاپ
تیرے چوبداروں سی تھی
اَب کی بار ایسے زلزلے لائے
کہ تیرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے
(اور در و دیوار کے ڈھیروں میں
کُرلاتا ہوا
گھُٹ گیا مکینوں کا لہو)
خاک و خوں کے اس گلاب سے
میں اپنے بھاری بوٹوں کو نکالوں کس طرح
یہ مری بندُوق میرے دوش پر ایک بوجھ ہے
اور زمیں مجھ کو نگلتی جا رہی ہے دم بدم
میرے مشرق
جانکنی کے اس مسلسل کرب سے
مجھ کو بچا میرے لہو میں ڈوب کر
میں ترا قاتل
ترا عیسا
مجھے مصلوب کر

جو سر بھی کشیدہ ہو اُسے دار کرے ہے
اغیار جو کہتے تھے سو اَب یار کرے ہے

وہ کون ستمگر تھے کہ یاد آنے لگے ہیں
تو کیسا مسیحا ہے کہ بیمار کرے ہے

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ دَر و دیوار کرے ہے

کیا دل کا بھروسہ ہے یہ سنبھلے کہ نہ سنبھلے
کیوں خود کو پریشاں مرا غمخوار کرے ہے

ہے ترکِ تعلق ہی مداوائے غمِ جاناں
پر ترکِ تعلق تو بہت خوار کرے ہے

اِس شہر میں ہو جنبشِ لب کا کسے یارا
یاں جنبشِ مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

تو لاکھ فراز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چُپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی

مگر یہ وردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیلے پار اُتر کر یہ ناخدا نے کہا
مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

چراغِ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہوا بھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فرازؔ
میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی

ہر کوئی جاتی ہوئی رُت کا اشارہ جانے
"گل نہ جانے بھی تو کیا باغ تو سارا جانے"

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

جان نکلی کسی بسمل کی نہ سورج نکلا
بجھ گیا کیوں شبِ ہجراں کا ستارا جانے

جو بھی مِلتا ہے ہمیں سے وہ گلہ کرتا ہے
کوئی تو صورتِ حالات خدارا جانے

دوست احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
کس نے خنجر مرے سینے میں اُتارا جانے

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہوگا کہ فراز
دشمنِ جاں کو بھی تو جان سے پیارا جانے

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہِ معلیٰ میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اک گنہگار انساں کھڑا ہے

نہ اُس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ محراب داغ ریا ہے

یہ وہ بد مقدّر ہے
جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے
غربال ہے
جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے
ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا
کہ جو تو نے کاذبِ جہاں کو عطا کیں

یہ مجرم ہے
ان سب بے غرض جرأتوں کا
جو تو نے ہر اک ناتواں عطا کیں
یہ کہتا ہے
اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انسان سب ہیں برابر
ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے
الفاظ سب ہی مقدّس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے

یہ سرکش
مقدر کو انساں کا راہوار کہتا ہے
آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر
یہ شوریدہ سر
حرف زن ہے
کہ محراب و منبر سے
فتوہ گر و فتنہ پرواز دیں
حرفِ حق بیچتے ہیں
فقیہانِ مسند نشیں
حرص دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیمبر
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

●●

سلام اُس پر!

حسینؑ!

اے پیکرِ سر بریدہ

بدن دریدہ

سدا ترا نام برگزیدہ

میں کربلا کے لہو لہو دشت میں تجھے

دشمنوں کے نرغے میں

تیغ در دست دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں
کہ تیرے سارے رفیق
سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے
چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافرانِ رہِ وفا لُٹ لٹا چکے ہیں
اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارۂ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے
اک داستاں کا حصّہ نہیں ہے
اِک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

ہیں آج اسی کربلا میں
بے آبرو۔ نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسین کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عزّ و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے

سلام اُس پر
سلام اُس پر

گلیوں میں کیا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی
کیا وصف اس شاعر میں تھا کیا بات اس پاگل میں تھی

ایسا ستم کیا ہو گیا اک راہرو تھا کھو گیا
پھر زندگی کی شام تھی اور شام بھی جنگل میں تھی

کیا کیا ہوا چلتی رہی، یہ لو مگر جلتی رہی
کیا زور اس آندھی میں تھا کیا تاب اس مشعل میں تھی

شعلہ بہ دل آتش بجاں پھرتا رہا وہ بے اماں
ورنہ صبا زلفوں میں تھی ورنہ گھٹا کاجل میں تھی

ترسی ہوئی آنکھوں میں کن کن ساحلوں کے خواب تھے
پر کشتیٔ عمرِ رواں حالات کی دلدل میں تھی

خلقت نے آوازے کسے طعنے دیے فتوے جڑے
وہ سخت جاں ہنستا رہا گو خودکشی پل پل میں تھی

اپنی کشید جاں سے ہی پیتا رہا جیتا رہا
نشہ کہاں ساغر میں تھا مستی کہاں بوتل میں تھی

چند شعری مجموعے

اميج ۔۔۔ بشیر بدر

شجر صدا ۔ عمیق حنفی

نرشادسنگ ۔ بلراج کومل